OPEN ACCESS
RUSHD
(Bi-Annual Research Journal of Islamic Studies)
Published by: ***Lahore Insititute for Social Sciences, Lahore.***

ISSN (Print): 2411-9482
ISSN (Online): 2414-3138
July-Dece-2023
Vol: 4, Issue: 2
Email: journalrushd@gmail.com
OJS: https://rushdjournal.com/index

Muhammad Nauman Asghar[1]

تقسیمِ وراثت میں عول، غامدی صاحب کے نقطہ نظر کا تحقیقی جائزہ

Research Review of Ghamidi Sahab's Perspective on 'Awl' in Inheritance Division

Abstract

Allah created humans and organized their life by divine laws mentioned in Quran and Sunnah. Among these laws is the "law of inheritance" and its distribution to distribute the legacy among the heirs justly and wisdomly. The principles and procedure of dividing legacy are mentioned in *Farāidh*, the branch of Islamic jurisprudence. The sub-branches of this science are agreed by most Islamic scholars, with little differences about certain issues. *Awl* is one of the subjects that are not debatable among the classic jurists, but modern-day Scholar Mr. Javed Ahmed Ghamdi's position is completely different in this regard as he negates the principle of "*Awl*". The current research adopts this subject to be its problem and explains the difference regarding this problem suggesting the most overwhelming opinion among th e Islamic jurists and scholars.

Keywords: Inheritance, Heirs, Islamic Jurist, Ghamidi

1 Alumni, University of Management and Technology, Lahore

تمہید

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں وراثت کے قوانین کا ذکر کرتے ہوئے تمام قریبی رشتہ داروں کے حصے خود متعین فرمادیے ہیں جیسے بیوی کے لیے ربع یا ثمن اور شوہر کے لیے نصف یا ربع۔[1] اسی طرح اولاد میں اگر ایک بیٹی ہو تو نصف اور دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ثلثان اور اگر بیٹا بیٹی دونوں ہوں تو لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر۔[2]

وراثت کی تقسیم میں بسا اوقات یہ صورت پیش آتی ہے کہ ورثاء کے حصے زیادہ ہو جاتے ہیں اور اس کے مقابلے میں میت کا ترکہ کم پڑ جاتا ہے جیسے ایک عورت کا انتقال ہوا اور اس نے ورثاء میں شوہر اور دو حقیقی بہنیں چھوڑیں تو قرآن کریم کے مطابق شوہر کو کل مال کا نصف ملے گا اور دو بہنوں کو کل مال کا ثلثان دیا جائے گا۔ اسے اگر ہم فیصد میں بیان کریں تو مطلب یہ بنتا ہے کہ شوہر کو کل مال کا 50 فیصد اور بہنوں کو کل مال کا 66.66 فیصد دیا جائے گا۔ یہاں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ورثاء کے حصے کل مال سے زیادہ ہو گئے یعنی اس صورت میں ورثاء کا حصہ کل مال سے 16.66 فیصد زیادہ بن رہا ہے۔

عول کی سب سے پہلی عملی صورت

عملی طور پر یہ صورت نبی کریم ﷺ کے دور میں پیش نہیں آئی۔ بلکہ آپ کے بعد اس طرح کا واقعہ سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں پیش آیا۔ چنانچہ مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک خاتون فوت ہوئی اور اس کے ورثاء میں شوہر، ماں اور حقیقی بہن موجود تھے۔ قرآن کریم کے مطابق شوہر کو کل مال کا نصف، ماں کو ثلث اور بہن کو نصف دیا جائے گا۔ اگر فیصد کے حساب سے دیکھا جائے تو اس صورت میں شوہر کا حصہ 50 فیصد، ماں کا 33.33 فیصد اور بہن کا 50 فیصد بنتا ہے یعنی اس صورت میں ورثاء کا حصہ کل مال سے 33.33 فیصد زیادہ بن رہا ہے۔ جب یہ مسئلہ حضرت عمر کے سامنے آیا تو انہوں نے فرمایا: ”واللہ! مجھے

---

[1] ۔ النساء:12

Al-Nisa:12

[2] ۔ النساء:11

Al-Nisa:11

نہیں معلوم کہ تم میں سے کس وارث کو اللہ نے مقدم کیا اور کسے مؤخر کیا۔"[1] انہوں نے ایسا اس لیے فرمایا کہ اس صورت میں اگر شوہر کو پورا حصہ دیا جائے تو بہن کا حصہ کم ہو جاتا ہے اور اگر بہن کو پورا حصہ دیا جائے تو شوہر کا حصہ کم ہو جاتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ورثاء کے حصے میت کے ترکے سے بھی بڑھ جائیں تو اس صورت میں کیا کیا جائے؟ اس حوالے سے ایک موقف تو جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے جسے پوری امت نے اختیار کیا اور ہمیشہ سے اسی پر عمل ہوتا چلا آیا ہے۔ جبکہ دوسرا موقف حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے جسے دیگر صحابہ اور علمائے امت نے عام طور پر قبول نہیں کیا۔ موجودہ دور میں ایک تیسرا موقف بھی سامنے آیا ہے جو جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا ہے۔ جو موقف غامدی صاحب نے پیش کیا ہے ان کے گمان کے مطابق وہی درست اور قرآنی نظم سے مطابقت رکھتا ہے، جبکہ جمہور صحابہ کرام کا موقف ان کے ہاں قرآن کریم کے خلاف ہے۔ ذیل میں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ غامدی صاحب نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ کس حد تک قرآن سے مطابقت رکھتا ہے اور کیا نظمِ قرآنی ان کے موقف کی تائید کرتی ہے؟ سب سے پہلے ہم اس موقف کو سمجھتے ہیں جو ہمیشہ سے امت کا رہا ہے اور جس پر آج تک عمل ہوتا چلا آیا ہے۔

جمہور کا موقف

یہ موقف جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے جن میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عباس، حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم وغیرہ شامل ہیں اور یہی مسلک جمہور فقہاء اور ائمہ اربعہ کا ہے۔[2]

ان حضرات کے مطابق جب ورثاء کے حصے کل ترکے سے زیادہ ہو جائیں تو ایسی صورت میں تمام ورثاء کے حصے ان کے متعین حصوں کے تناسب سے کم کر دیے جائیں گے تاکہ میت کا ترکہ سب ورثاء میں ان کے حصوں

---

[1] ۔ الجماعة، الموسوعة الفقهية الكويتية، (الكويت: وزارة الأوقاف، 1427ھ)، 3: 47
Al-Jama'ah, Al-Mawsu'ah Al-Fiqhiyyah Al-Kuwaitiyyah (Wazarat Al-Awqaf, Al-Kuwait, 1427 AH), 3: 47

[2] ۔ ابن قدامة، عبد الله بن أحمد، المغني، (مصر، مكتبة القاهرة، 1969م)، 6: 282
Ibn Qudamah, Abdullah ibn Ahmad, Al-Mughni (Maktabat Al-Qahira, Egypt, 1969 AD), 6: 282".

کے بقدر تقسیم ہو جائے۔ اسے اصطلاحی الفاظ میں عول سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مشہور روایت کے مطابق سب سے پہلے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو عول کا مشورہ دیا۔ بعض روایات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بعض میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا نام مشورہ دینے والوں میں شامل ہے۔ بہر حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں عول کے مسئلے پر تمام صحابہ کا اتفاق ہو گیا۔[1]

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: امیر المؤمنین! اگر کوئی شخص چھ درہم چھوڑ کر فوت ہوا اور اس پر کل سات درہم کا قرض تھا جن میں سے ایک آدمی کے تین اور دوسرے کے چار درہم تھے تو آپ کیسے ادائیگی کریں گے؟ کیا آپ چھ درہم کے سات حصے نہیں کریں گے؟ حضرت عمر نے فرمایا بالکل ایسا ہی کروں گا۔ حضرت عباس نے فرمایا وراثت میں بھی یہی صورت ہے۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عول کے مطابق فیصلہ صادر فرما دیا۔[2]

عول کی صورت میں ہر وارث کا حصہ اسی تناسب سے کس طرح کم ہوتا ہے اسے ہم مثال سے سمجھتے ہیں۔ فرض کریں کہ میت کے ورثاء میں اگر شوہر اور دو حقیقی بہنیں ہوں تو شوہر کا حصہ نصف اور بہنوں کا ثلثان بنتا ہے یعنی 50 فیصد شوہر کا اور 66.66 فیصد بہنوں کا۔ چونکہ اس صورت میں حصے زیادہ بن رہے ہیں لہذا کل ترکے کے سات حصے کیے جائیں گے جن میں سے تین حصے شوہر کو اور چار حصے بہنوں کو دیں گے۔ اگر فیصد میں دیکھا جائے تو اس صورت میں شوہر کو 42.85 فیصد اور بہنوں کو 57.15 فیصد دیا جائے گا۔ یہاں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہر وارث کا حصہ اس کے متعین حصے کے تناسب سے کم کر دیا گیا ہے اور اسی کا نام عول ہے۔

عول کی ایک اور مثال شوہر، ماں اور بہن کی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں سب سے پہلے پیش آئی۔ اس صورت میں شوہر کا حصہ نصف، ماں کا ثلث اور بہن کا نصف ہے یعنی شوہر کا 50 فیصد، ماں کا 33.33 فیصد اور بہن کا 50 فیصد ہے۔ اس صورت میں بھی چونکہ حصے زیادہ بن رہے ہیں لہذا کل مال کے آٹھ حصے کر کے تین

---

[1]۔ الجماعة، الموسوعة الفقهية الكويتية، 3: 47
Al-Jama'ah, Al-Mawsu'ah Al-Fiqhiyyah Al-Kuwaitiyyah, 3: 47

[2]۔ الصاوي، محمد بن احمد، حاشية الصاوي على الشرح الصغير، (مصر: دار المعارف)، 4: 645
As-Sawi, Muhammad ibn Ahmad, Hashiya As-Sawi 'la Ash-Sharh As-Sagheer (Dar Al-Ma'arif, Egypt), 4: 645

شوہر کو، دوماں کو اور تین بہن کو دیے جائیں گے۔ اس مسئلے کو "مباھلہ" کہا جاتا ہے، کیونکہ اسے سن کر حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تھا: "اگر کوئی چاہے تو میں اس بات پر مباہلہ کر سکتا ہوں کہ مسائل میں عول نہیں ہوتا۔"[1] اگر فیصد میں دیکھا جائے تو اس صورت میں شوہر کا حصہ 37.5 فیصد، ماں کا 25 فیصد اور بہن کا 37.5 فیصد بنتا ہے۔ یہاں بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہر وارث کا حصہ اس کے متعین حصے کے تناسب سے کم کر دیا گیا ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی پیش آیا تھا۔ مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ کسی نے سوال کیا: اگر بیوی، دو بیٹیاں اور ماں باپ وارث ہوں تو ترکہ کیسے تقسیم کیا جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فی البدیہ جواب دیا کہ اس صورت میں بیوی کو آٹھویں کی بجائے نواں حصہ ملے گا۔ اسے مسئلہ "منبریہ" بھی کہا جاتا ہے۔[2] مذکورہ صورت میں قرآن کریم کے مطابق بیوی کا حصہ ثمن، ماں باپ میں سے ہر ایک کا سدس اور بیٹیوں کا ثلثان بنتا ہے۔ اگر فیصد کے حساب سے دیکھیں تو بیوی کا حصہ 12.5 فیصد، ماں کا 16.66 فیصد، باپ کا 16.66 فیصد اور بیٹیوں کا 66.66 فیصد بنتا ہے۔ اس صورت میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ورثاء کے حصے کل ترکہ سے 12.5 فیصد زیادہ بن رہے ہیں۔ لہٰذا عول کے اصول پر عمل کرتے ہوئے تمام ورثاء کے حصے ان کے متعین حصوں کے تناسب سے کم کر دیے جائیں گے اور یوں کل مال کے 27 حصے ہوں گے جن میں سے بیوی کو 3، ماں کو 4، باپ کو 4 اور بیٹیوں کو 16 حصے دیے جائیں گے۔ چنانچہ عول کے بعد اب بیوی کا حصہ کم ہو کر 11.11 فیصد رہ جائے گا جو کل مال کا نواں حصہ بنتا ہے اور اسی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یوں فرمایا تھا: "صار ثمنها تسعا"۔ اس کے علاوہ ماں باپ میں سے ہر ایک کا حصہ کم ہو کر 14.81 اور بیٹیوں کا حصہ کم ہو کر 59.26 فیصد رہ جائے گا۔

---

[1] ۔ البهوتي، منصور بن يونس، شرح منتهى الإرادات، (مصر، عالم الكتب، 1993م)، 2: 520
Al-Buhuti, Mansur ibn Yunus, Sharh Muntaha al-Iradat (Alam al-Kutub, Egypt, 1993 AD), 2: 520

[2] ۔ البهوتي، منصور بن يونس، كشاف القناع عن متن الإقناع، (بيروت، دار الكتب العلمية، 1388م)، 4: 432
Al-Buhuti, Mansur ibn Yunus, Kashf al-Qina 'an Matn al-Iqna ' (Dar al-Kutub al-'Ilmiyya, Beirut, 1388 AH), 4: 432

ایک اشکال کا جواب

عول کی صورت میں بعض لوگ یہ اشکال کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں تمام ورثاء کے حصے خود بتادیے تو ان کو متعین حصوں سے کم دینا کیسے جائز ہو گیا۔ جیسے بیوی کا حصہ اولاد کی موجودگی کی صورت میں ثمن ہے اور مسئلہ منبریہ میں ہم نے دیکھا کہ اسے آٹھویں حصے کی بجائے نواں حصہ دیا گیا ہے۔ اسی طرح ماں باپ اور بیٹیوں کو بھی ان کے متعین حصوں سے کم دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جو اصول و قوانین اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان کیے نعوذ باللہ وہ درست نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ہر وارث کا حصہ متعین ضرور کیا ہے لیکن یہ کہیں نہیں کہا کہ وہ حصے لازمی طور پر ان میں پورے پورے تقسیم بھی ہو جائیں گے۔ بلکہ ایسا ہونا عین ممکن ہے کہ ورثاء کے حصے کل مال سے زیادہ ہو جائیں جیسا کہ ما قبل میں اس کی مثالیں گزر چکیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حصے تقسیم کرنے کے بعد مال بچ جائے جیسے میت کی ماں اور ایک بیٹی ہو تو قرآن کے مطابق ماں کو سدس اور بیٹی کو نصف ملے گا یعنی ماں کو 16.66 فیصد اور بیٹی کو 50 فیصد ملے گا۔ اس صورت میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ 33.33 فیصد مال بچ گیا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی صورت پیش آتی ہے تو اس کا حل قرآن کریم میں واضح طور پر نہیں بتایا گیا بلکہ اسے علماء کے اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا ہے جیسے اور بہت سے مسائل میں ہم دیکھتے ہیں کہ بنیادی ہدایات قرآن کریم میں موجود ہوتی ہیں لیکن اس کی جزئیات و تفصیلات میں علماء اجتہاد کرتے ہیں۔ وراثت کا یہ مسئلہ بھی انہی مسائل میں سے ہے جن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اجتہاد کیا اور اجتہاد کے بعد ایک رائے پر اتفاق کر لیا۔ ظاہر ہے کہ صحابہ کرام قرآن و حدیث کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے، قرآن انہی کی زبان میں نازل ہوا تھا اور انہوں نے علم براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا اس لیے جب وہ کسی مسئلے میں اجتہاد کریں اور اس پر اتفاق کر لیں تو وہ سب سے معتبر اجتہاد سمجھا جاتا ہے اور اس کی پیروی کرنا امت پر لازم ہو جاتا ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ مسئلہ سامنے آیا کہ ورثاء کے حصے کل مال سے زیادہ ہو گئے تو انہوں نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ مشورے کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ یہ صورت اس سے ملتی جلتی ہے کہ میت نے ترکے میں مال کم چھوڑا جبکہ اس پر قرض زیادہ اور لینے والے ایک سے زائد ہیں۔ ایسی صورت میں یہ تو نہیں کیا جا سکتا کہ میت کا سارا مال ایک ہی قرض خواہ کو دے دیں، بلکہ عادلانہ صورت یہ ہے کہ ہر قرض خواہ کو اس

کے قرض کے تناسب سے ترکے میں سے رقم دی جائے تاکہ کوئی محروم نہ ہو۔ ورثاء کے حصے زیادہ ہونے کی صورت میں بھی عادلانہ صورت یہی ہو گی کہ سب ورثاء کا حصہ ان کے متعین حصوں کے تناسب سے کم کر دیا جائے تاکہ کوئی بھی وارث محروم نہ ہو یا کسی ایک کا حصہ بالکل ہی کم نہ ہو جائے۔ یہی بات صحابہ کرام کے پیشِ نظر تھی جس کی بنیاد پر انہوں نے عول کے اصول پر اتفاق کیا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف

جمہور صحابہ کرام کا موقف ما قبل میں گزرا کہ ورثاء کے حصوں کے زیادہ ہونے کی صورت میں انہوں نے عول کے اصول پر اتفاق کیا۔ صحابہ میں سے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف اس سے مختلف تھا اور وہ عول کے قائل نہیں تھے۔ ان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے کچھ ورثاء کو مقدم رکھا ہے اور کچھ کو مؤخر۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے مقدم کیا ہے انہیں کل ترکے میں سے حصہ ملے گا اور جنہیں مؤخر کیا ہے انہیں ایسی صورت میں بچا ہوا مال دیا جائے گا۔ چنانچہ ان کے موقف کی تفصیل ایک روایت میں اس طرح آئی ہے:

زفر بن اوس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ان سے گفتگو کرنے کے لیے گئے تو انہوں نے دورانِ گفتگو یہ ارشاد فرمایا: اللہ کی ذات ہر عیب سے پاک ہے جس نے ریت کے ذروں کو بھی گن رکھا ہے۔ وہ اس بات سے بھی پاک ہے کہ وراثت میں نصف، نصف اور ثلث مقرر کرے کہ نصف اور نصف سے مال ختم ہو جائے اور ثلث دینے کے لیے کچھ نہ بچے۔ اللہ کی قسم! اگر وہ ان ورثاء کو مقدم کرتے جنہیں اللہ نے مقدم کیا اور ان ورثاء کو مؤخر کرتے جنہیں اللہ نے مؤخر کیا تو حصص کبھی بھی زیادہ نہ ہوتے۔ زفر فرماتے ہیں: میں نے پوچھا کہ اللہ نے کن کو مقدم کیا اور کن کو مؤخر؟ انہوں نے فرمایا: جن ورثاء کو اللہ تعالیٰ نے ایک متعین حصے سے کم کر کے دوسرا متعین حصہ دیا ہے یہ وہ ہیں جنہیں اللہ نے مقدم کیا اور جن ورثاء کو ایک متعین حصے سے کم کر کے مابقی دیا ہے یہ وہ ہیں جنہیں اللہ نے مؤخر کیا۔ زفر فرماتے ہیں کہ میں نے سوال کیا کہ سب سے پہلے عول کے اصول پر کس نے عمل کیا؟ انہوں نے فرمایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے۔ پھر میں نے پوچھا کہ

کیا آپ نے انہیں مشورہ نہیں دیا تھا؟ انہوں نے فرمایا کہ وہ بہت بارعب شخصیت تھے تو میں ان سے رعب میں آ گیا تھا۔[1]

ایک متعین حصے سے کم کر کے دوسرا متعین حصہ مقرر کرنے سے ان کی مراد ماں اور زوجین ہیں کہ ماں کو کبھی ثلث اور کبھی سدس ملتا ہے۔ اسی طرح شوہر کو کبھی نصف اور کبھی ربع اور بیوی کو کبھی ربع اور کبھی ثمن ملتا ہے۔

اور متعین حصے سے کم کر کے مابقی لینے والے ورثاء سے ان کی مراد بیٹیاں اور بہنیں ہیں کہ اکیلا ہونے کی صورت میں انہیں نصف یا ثلثان ملتا ہے جبکہ بیٹوں اور بھائیوں کے ساتھ انہیں متعین حصہ نہیں ملتا، بلکہ مابقی ملتا ہے۔ گویا حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک جب ورثاء میں شوہر، ماں اور حقیقی بہن موجود ہوں تو بہن کو نصف نہیں دیا جائے گا، بلکہ شوہر کو نصف اور ماں کو ثلث دینے کے بعد مابقی بہن کو دیا جائے گا۔ اسی طرح مسئلہ منبریہ کی صورت میں جب بیوی، ماں باپ اور دو بیٹیاں وارث ہوں تو دو بیٹیوں کو ثلثان نہیں دیا جائے گا، بلکہ بیوی کو ثمن اور ماں باپ میں سے ہر ایک کو سدس دینے کے بعد مابقی بیٹیوں کو دیا جائے گا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اجتہاد کا خلاصہ یہ ہوا کہ قرآن کریم میں جن ورثاء کے حصے بیان کیے گئے ہیں وہ دو طرح کے ورثاء ہیں: ایک تو وہ جن کو ہمیشہ متعین حصہ ملتا ہے جیسا کہ ماں، بیوی، شوہر اور ماں شریک بہن بھائی۔ دوسرے وہ ورثاء جن کو ہمیشہ متعین حصہ نہیں ملتا، بلکہ بعض صورتوں میں وہ متعین حصہ لیتے ہیں اور بعض صورتوں میں کل ترکے کا مابقی لیتے ہیں جیسا کہ بیٹیاں، حقیقی بہنیں اور باپ شریک بہنیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان ورثاء میں تقسیم کی صورت یہ ہو گی کہ پہلی قسم کے ورثاء کو حصہ دینے کے بعد دوسری قسم کے ورثاء کو دیا جائے گا یعنی ان میں تقدیم و تاخیر کا قانون لاگو ہو گا۔ اگر اس طرح ترکہ مکمل تقسیم ہو جائے تو ٹھیک وگرنہ حصے زیادہ ہونے کی صورت میں دوسری قسم کے ورثاء یعنی بہن اور بیٹی کو ترکے کا مابقی دیا جائے گا۔ گویا حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک قرآن کریم کی بیٹی کے حصے سے متعلق یہ آیت ﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾ اور بہن کے حصے سے متعلق یہ

[1]۔ ابن قدامة، عبد الله بن أحمد، المغني، 6: 282
Ibn Qudamah, Abdullah ibn Ahmad, Al-Mughni, 6: 282

آیت ﴿إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ﴾ مطلق نہیں ہیں، بلکہ ان صورتوں کے ساتھ خاص ہیں جب ان کا پہلی قسم کے ورثاء کے ساتھ کوئی تعارض نہ ہو رہا ہو۔ لیکن اگر پہلی قسم کے ورثاء کے ساتھ تعارض کی صورت ہو یعنی حصے زیادہ بن رہے ہوں تو پھر انہیں متعین حصے کی بجائے ترکے کا مابقی دیا جائے گا جیسا کہ انہیں بیٹوں اور بھائیوں کی موجودگی میں مابقی ملتا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ موقف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں بیان کیا تھا، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے ان کی رائے سے موافقت نہیں کی اور علمائے امت نے بھی عام طور پر اسے قبول نہیں کیا۔[1] صرف محمد بن حنفیہ، محمد بن علی بن حسین، امام عطاء اور امام داؤد رحمۃ اللہ علیہم سے اس طرح کا قول منقول ہے۔ اس کے علاوہ تمام صحابہ کرام، تابعین عظام، ائمہ اربعہ اور ہر دور کے فقہاء و مجتہدین نے عول کے اصول ہی پر عمل کیا ہے جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں اتفاق ہو گیا تھا۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمۃ اللہ علیہ جو چھٹی اور ساتویں ہجری کے فقیہ گزرے ہیں فرماتے ہیں:

"وَلَا نَعْلَمُ الْيَوْمَ قَائِلًا بِمَذْهَبِ ابْنِ عَبَّاسٍ، وَلَا نَعْلَمُ خِلَافًا بَيْنَ فُقَهَاءِ الْأَمْصَارِ فِي الْقَوْلِ بِالْعَوْلِ، بِحَمْدِ اللَّهِ وَمَنِّهِ."[2]

"ہمیں کسی کے بارے میں معلوم نہیں کہ آج کے دور میں وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مذہب کا قائل ہو اور نہ ہی یہ معلوم ہے کہ فقہاء میں سے کسی نے عول کے اصول سے اختلاف کیا ہو۔ یہ سب اللہ کا شکر اور احسان ہے۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے موقف پر خود ان کے اصول کے مطابق ایک اشکال ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر ورثاء میں شوہر، ماں اور دو ماں شریک بہنیں ہوں تو جمہور کے مسلک پر تو شوہر کو نصف، ماں کو سدس اور ماں شریک بہنوں کو ثلث ملے گا اور ترکہ پورا تقسیم ہو جائے گا۔ لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مسلک یہ بھی ہے کہ اگر

---

[1]۔ الجماعة، الموسوعة الفقهية الكويتية، 3: 47
Al-Jama'ah, Al-Mawsu'ah Al-Fiqhiyyah Al-Kuwaitiyyah, 3: 47

[2]۔ ابن قدامة، عبد الله بن أحمد، المغني، 6: 283
Ibn Qudamah, Abdullah ibn Ahmad, Al-Mughni, 6: 283

بہن بھائی تین یا تین سے زائد ہوں تب ماں کا حصہ کم ہو کر سدس ہوتا ہے، لیکن اگر بہن بھائی دو ہوں تو ماں کو ثلث ملتا ہے۔ اس صورت میں ان کے مسلک پر شوہر کو نصف، ماں کو ثلث اور ماں شریک بہنوں کو ثلث ملے گا یعنی شوہر کا حصہ 50 فیصد، ماں کا 33.33 فیصد اور دو ماں شریک بہنوں کا 33.33 فیصد بنتا ہے۔ یہاں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ حصص کل مال سے 16.66 فیصد زیادہ ہو گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ورثاء کی جو دو قسمیں بیان کی تھیں ماں شریک بہنیں ان میں سے پہلی قسم میں شامل ہیں کیونکہ یہ وہ ورثاء ہیں جن کا حصہ اللہ تعالیٰ نے متعین کر دیا ہے اور انہیں مابقی نہیں دیا گیا۔ لہذا اس صورت میں اگر کسی وارث کا حصہ کم کر دیتے ہیں تو وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اصول پر درست نہیں ہو گا کیونکہ سب ورثاء پہلی قسم کے ہیں جن کا حصہ متعین ہے۔ اب یہاں تقسیم کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے عول کہ سب ورثاء کا حصہ ان کے متعین حصے کے تناسب سے کم کر دیا جائے۔[1]

جناب غامدی صاحب کا موقف

اس حوالے سے غامدی صاحب نے جو موقف پیش کیا ہے وہ مذکورہ بالا دونوں نقطہ ہائے نظر سے مختلف ہے۔ ان کا طرزِ استدلال بھی اس لحاظ سے بالکل الگ ہے کہ وہ قرآن کریم کے اسلوب اور نظم سے اپنا مدعیٰ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں مذکور ماں باپ اور زوجین کا متعین حصہ لازمی طور پر کل مال میں سے دیا جائے گا۔ جبکہ اولاد کا حصہ جو شروع میں بتایا گیا ہے، اسی طرح بہنوں کا حصہ جو سورۃ کے آخری رکوع میں بتایا گیا ہے یہ انہیں کل مال میں سے نہیں، بلکہ ماں باپ اور زوجین کو دینے کے بعد مابقی میں سے دیا جائے گا۔ گویا غامدی صاحب کے نزدیک اگر ورثاء میں شوہر اور دو بیٹیاں ہوں تو شوہر کو ربع دینے کے بعد مابقی کے دو ثلث بیٹیوں کو دیے جائیں گے۔ اگر فیصد میں دیکھیں تو مطلب یہ بنے گا کہ 25 فیصد شوہر کو دینے کے بعد باقی 75 فیصد کے دو ثلث یعنی 50 فیصد بیٹیوں کو دیا جائے گا۔ اسی طرح مسئلہ منبریہ کی صورت میں جب

---

[1]۔ ابن مفلح، إبراهيم بن محمد، المبدع في شرح المقنع (بيروت، دار الكتب العلمية، 1418ھ)، 5: 352
Ibn Mufallah, Ibrahim ibn Muhammad, Al-Mubdi' fi Sharh al-Muqni' (Dar al-Kutub al-Ilmiyya, Beirut, 1418 AH), 5: 352

ورثاء میں بیوی، ماں باپ اور دو بیٹیاں ہوں تو غامدی صاحب کے ہاں بیوی کو ثمن اور ماں باپ میں سے ہر ایک کو سدس دینے کے بعد بیٹیوں کو مابقی کا ثلثان دیا جائے گا۔ اسے اگر فیصد میں بیان کریں تو مطلب یہ بنتا ہے کہ بیوی کو 12.5 فیصد اور ماں باپ میں سے ہر ایک کو 16.66 فیصد کل مال میں سے دیا جائے گا۔ اس کے بعد مابقی 54.17 کے دو ثلث یعنی 36.11 فیصد بیٹیوں کو دیا جائے گا۔

غامدی صاحب اپنی تفسیر "البیان" میں آیت ﴿وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> "یہ جملہ اِس سے متصل پہلے لڑکیوں کے حصوں پر نہیں، بلکہ اُس پورے حکم پر عطف ہوا ہے جو اوپر اولاد کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ اِس کا عطف اب استدراک کے لیے ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس سے پہلے یہ بات تو بیان ہوئی ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہو گا، لیکن یہ کتنا ہو گا، اِسے متعین نہیں کیا گیا۔ چنانچہ والدین اور زوجین کے جو حصے اِس کے بعد آئے ہیں، وہ لازماً پہلے دیے جائیں گے اور اِس کے بعد جو کچھ بچے گا، صرف وہی اولاد میں تقسیم ہو گا۔ لڑکے اگر تنہا ہوں تو اُنھیں بھی یہی ملے گا اور لڑکے لڑکیاں، دونوں ہوں تو اُن کے لیے بھی یہی قاعدہ ہو گا۔ اِسی طرح میت کی اولاد میں اگر تنہا لڑکیاں ہوں تو اُنھیں بھی اِس بچے ہوئے ترکے ہی کا نصف یا دو تہائی دیا جائے گا۔ اِس کے لیے 'فَإِنْ كُنَّ نِسَآءً' کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، اُن کے بارے میں ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ یہ 'لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ' سے استثنا اور اِسی کے ایک پہلو کی وضاحت ہیں، اِن کا حکم اُس سے مختلف نہیں ہو سکتا۔"[1]

گویا غامدی صاحب کے نزدیک قرآن کریم کا اسلوب یہ بتا رہا ہے کہ اولاد کا حصہ جو رکوع کے شروع میں بیان کیا گیا ہے وہ انہیں میت کے ماں باپ اور زوجین کا حصہ ادا کرنے کے بعد مابقی میں سے دیا جائے گا۔

---

[1] ۔ غامدی، جاوید احمد، البیان (المورد، لاہور)، 1: 11
Ghamidi, Javed Ahmad, Al-Bayan (Al-Mawrid, Lahore), 1: 11

غامدی صاحب کے موقف پر تبصرہ

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی قرآن کے اسلوب اور نظم سے ایسا ثابت ہو رہا ہے جیسا غامدی صاحب فرمارہے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنی نظم سے ایسا بالکل بھی ثابت نہیں ہو رہا اور اس کی کئی وجوہات ہیں:

1۔ پہلی بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ اولاد کا حصہ بیان کرتے ہوئے قرآن کریم نے جب لڑکوں کا ذکر کیا تو صرف یہ ضابطہ بیان کیا: ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾ یعنی لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے جس سے اتنی بات تو یقینی طور پر معلوم ہو گئی کہ قرآن کریم نے بیٹے کا حصہ متعین نہیں کیا۔ وہ چاہے اکیلا ہو یا اس کے ساتھ بہنیں ہوں دونوں صورتوں میں اسے بطورِ تعصیب حصہ دیا جائے گا یعنی دیگر ذوی الفروض کو حصہ دینے کے بعد باقی مال بیٹے کو ملے گا۔ اگر اکیلا ہو تو باقی سب مال بیٹے کا اور اگر ساتھ بہنیں بھی ہوں تو باقی مال اس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ بیٹے کو دو بیٹیوں کے برابر حصہ ملے۔

اس کے بعد قرآن نے جب بیٹیوں کا ذکر کیا تو ان کا حصہ متعین کر دیا۔ اگر ایک بیٹی ہو تو نصف اور دو یا زیادہ ہوں تو ثلثان۔ یہاں نظمِ قرآن میں کوئی بھی ایسا لفظ یا جملہ نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ بیٹی کے یہ حصص مابقی مال میں سے دیے جائیں گے، بلکہ اس کے برعکس اسلوبِ بیان یہ بتا رہا ہے کہ نصف یا ثلثان انہیں کل مال میں سے ہی دیا جائے گا۔ قرآن کے الفاظ ہیں: ﴿فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾[1]

یہاں "ماترک" کے الفاظ قابلِ غور ہیں، کیونکہ اس میں ما موصولہ ہے جو عموم پر دلالت کر رہا ہے اور "ترک" میں ضمیر میت کی طرف لوٹ رہی ہے اور مطلب یہ بنتا ہے کہ میت نے جو کچھ مال چھوڑا ہے اس کا نصف یا ثلثان بیٹیوں کو دیا جائے۔ ان الفاظ میں ایک طرح سے صراحت ہے کہ بیٹوں کی عدم موجودگی میں بیٹیوں کو نصف یا ثلثان کل ترکہ میں سے دیا جائے گا، مابقی میں سے نہیں۔

---

[1]۔ النساء:11

Al-Nisa:11

2۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ترکے میں سے حصہ دینے کے لیے جس طرح کی ترکیب قرآن میں ماں باپ اور زوجین کے لیے استعمال ہوئی ہے بالکل اسی طرح کی ترکیب بیٹیوں اور بہنوں کے لیے بھی استعمال ہوئی ہے۔ دیکھیے قرآن کریم میں ماں باپ کا حصہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا: ﴿وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ﴾ شوہر کا حصہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا: ﴿فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ﴾ بیوی کا حصہ بیان کرتے ہوئے کہا: ﴿فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم﴾ آیات کے ان جملوں میں غامدی صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان ورثاء کو ترکہ کل مال میں سے دیا جائے گا یعنی وہ مماترک، مماترکن اور مماترکتم سے عموم مراد لیتے ہیں۔ اب غور فرمایئے کہ اسی طرح کے جملے اور تراکیب بیٹیوں اور بہنوں کے لیے بھی موجود ہیں: بیٹیوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ﴾[1] اور بہنوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ﴾[2]

یہاں بھی دونوں جگہ ماترک کے الفاظ ہیں جن میں عموم ہے۔ لیکن غامدی صاحب کے اصول پر بہنوں اور بیٹیوں کو مابقی میں سے حصہ ملتا ہے، کل مال میں سے نہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ان آیات میں "ماترک" اپنے عموم پر نہیں رہے گا۔ یعنی قرآن تو یہ کہہ رہا ہے کہ بیٹیوں اور بہنوں کو نصف یا ثلثان میت کے "ماترک" میں سے دیا جائے، لیکن غامدی صاحب یہ فرمارہے ہیں کہ انہیں نصف یا ثلثان "ماترک" میں سے نہیں بلکہ مابقی میں سے دیا جائے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ قرآن کے اسی مفہوم کو ترجیح ہو گی جو اس سے بالکل واضح طور پر سمجھ آرہا ہے یعنی حصے کی کل مال سے ادائیگی۔ خلاصہ یہ کہ قرآنی نظم و اسلوب اور الفاظ و جملوں کی تراکیب سے یہ بات واضح ہے کہ بیٹیوں اور بہنوں کو میت کے کل مال میں سے حصہ ملے گا، مابقی میں سے نہیں۔

یہاں شاید کوئی یہ سوال کرے کہ جب ورثاء میں بیٹے اور بیٹیاں دونوں موجود ہوں تو انہیں کل مال میں سے نہیں، بلکہ مابقی میں سے حصہ ملتا ہے یعنی ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو بچے وہ ملتا ہے تو جب آپ نے

---

[1] ۔ النساء:11
Al-Nisa:11

[2] ۔ النساء:176
Al-Nisa:176

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ والے جملے میں ترکے کا مابقی مراد لیا ہے تو اس سے اگلے جملے میں ترکے کا مابقی کیوں مراد نہیں ہو سکتا؟

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ میں حصص کی تعیین نہیں کی گئی تو لازمی بات ہے کہ جن کا حصہ متعین ہے انہیں دینے کے بعد ہی غیر متعین حصے والے ورثاء کو ملے گا، جبکہ اگلے جملے میں اکیلی بیٹیوں کی صورت میں ان کا حصہ نصف یا ثلثان متعین کر دیا گیا ہے۔ لہذا ایسی صورت میں لازمی طور پر انہیں متعین حصہ ہی ملے گا اور متعین حصہ کل مال سے ہی ہوتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اولاد کے حصص بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے دو صورتوں کا ذکر کیا ہے: ایک بیٹوں کی موجودگی اور دوسرا عدم موجودگی۔ اگر بیٹے موجود ہوں تو اس کے لیے الگ ضابطہ ہے یعنی ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ اس میں "ماترک" کے الفاظ موجود نہیں کہ جس سے کل ترکے میں سے دیا جانا ثابت ہو، جبکہ دوسری صورت میں جب بیٹے موجود نہ ہوں، صرف بیٹیاں ہوں وہاں اللہ تعالیٰ نے "ماترک" کے الفاظ ذکر کیے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس صورت میں ان کا حصہ کل ترکے میں سے دیا جائے گا۔

3۔ غامدی صاحب نے بیٹیوں اور بہنوں کو مابقی میں سے نصف اور ثلثان دینے کا جو اصول بیان کیا ہے اس میں ایک قانونی سقم ہمیشہ رہے گا اور وہ یہ کہ جب بھی ورثاء میں بیٹیاں اور بہنیں ہوں گی ترکے کا مال کبھی بھی پورا پورا تقسیم نہیں ہو گا بلکہ لازمی طور پر بچ جائے گا۔ اس لیے کہ غامدی صاحب کے اصول پر ماں باپ اور زوجین کو کل مال میں سے حصہ دینے کے بعد بیٹیوں اور بہنوں کو مابقی نہیں ملتا، بلکہ مابقی کا بھی نصف یا ثلثان انہیں دیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب مابقی میں سے نصف دیں گے تو اس کا نصف بچ جائے گا اور اگر ثلثان دیں گے تو اس کا ثلث بچ جائے گا۔ ایک طرف غامدی صاحب ترکے کے مال سے زیادہ ہونے کو قانونی سقم قرار دیتے ہیں اسی لیے وہ عول کے قائل نہیں اور اسی عول سے بچنے کے لیے وہ آیاتِ میراث میں کئی مقام پر جمہور صحابہ اور پوری امت کی قرآن فہمی سے اختلاف کر جاتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف میراث سے متعلق قرآنی آیات کی جو تشریح وہ کرتے ہیں اس میں خود سقم موجود ہے۔ کیونکہ ان کی ذکر کردہ تعبیر پر مال اگرچہ زیادہ نہیں ہوتا، لیکن لازمی طور پر بچ جاتا ہے اور کبھی بھی پورا تقسیم نہیں ہوتا۔

4۔ چونکہ غامدی صاحب کی بتائی ہوئی قرآنی تعبیر کے مطابق لڑکیوں کے ہوتے ہوئے مال ہمیشہ بچ جاتا ہے تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ بچا ہوا مال کسے دیا جائے؟ اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں:

اِسی طرح یہ رہنمائی بھی ضمناً اِس آیت سے حاصل ہوتی ہے کہ ترکے کا کچھ حصہ اگر بچا ہوا رہ جائے اور مرنے والے نے کسی کو اُس کا وارث نہ بنایا ہو تو اُسے بھی 'أقرب نفعًا' کو ملنا چاہیے۔ بخاری کی ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ نے یہی بات فرمائی ہے:

"أَلْحِقُوا الفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا، فَمَا تَرَكَتِ الفَرَائِضُ فَلِأَوْلَى رَجُلٍ ذَكَرٍ"[1]

"وارثوں کو اُن کا حصہ دو، پھر اگر کچھ بچے تو وہ قریب ترین مرد کے لیے ہے۔"[2]

غامدی صاحب کے شاگرد جناب حسن الیاس صاحب اپنے استاد کی یہ بات زیادہ وضاحت سے یوں بیان کرتے ہیں کہ اگر مال بچ جائے تو چار طرح کے آپشن موجود ہیں: ایک یہ کہ میت مرنے سے پہلے وصیت کر جائے کہ بچا ہوا مال انہی بیٹیوں اور بہنوں کو دے دیا جائے جنہوں نے نصف یا ثلثان پہلے وصول کر لیا ہے۔ دوسرا آپشن یہ کہ میت مرنے سے پہلے اپنے کسی رشتہ دار کے لیے وصیت کر جائے۔ تیسرا یہ کہ غیر رشتہ دار کے لیے وصیت کر جائے۔ اور اگر ان میں سے کوئی آپشن اختیار نہیں کیا جاتا تو چوتھا آپشن یہ ہو گا کہ قرآنی اصول اقرب نفعا کے تحت اور نبی کریم ﷺ کی درجِ بالا حدیث کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قریبی مرد رشتہ دار کو حصہ دے دیا جائے۔[3]

غامدی صاحب کے بیان کردہ درجِ بالا اصول میں بھی کئی طرح کے قانونی سقم موجود ہیں۔ انہوں نے جو پہلا آپشن دیا ہے کہ میت مرنے سے پہلے انہی بیٹیوں اور بہنوں کے لیے وصیت کر جائے جنہیں وراثت میں سے

---

[1]۔ البخاري، محمد بن اسماعيل، الجامع الصحيح، (بيروت، دار طوق النجاة، 1422ھ) رقم الحديث:6746

Al-Bukhari, Muhammad ibn Ismail, Al-Jami' al-Sahih (Beirut, Dar Touq al-Najah, 1422 AH) Hadith Number: 6746

[2]۔ غامدی، جاوید احمد، میزان، 525

Ghamidi, Javed Ahmad, Meezan, 525

[3]https://www.youtube.com/watch?v=ClegeNYsbc&list=PLvDnnnkYLWQcLNuGzEmivv0a8Mc_9zTd_&index=4

حصہ مل چکا ہے تو اس حوالے سے عرض ہے کہ جب انہیں وراثت میں سے حصہ مل چکا ہے تو انہی کے لیے وصیت کے کیا معنی؟ وارث کے لیے وصیت کرنا تو عقلی طور پر بھی بے معنی ہے کیونکہ ان کا حصہ پہلے سے مقرر ہے اور پھر نبی کریم ﷺ نے بھی اس کی اجازت نہیں دی کہ وارث کے لیے وصیت کی جائے جیسا کہ مشہور حدیث "لاوصیۃ لوارث"[1] میں اس کی ممانعت موجود ہے۔ مزید یہ کہ قرآن کریم کے اسلوب کو دیکھا جائے تو اس نے ورثاء کے حصے بیان کرتے ہوئے ہمیشہ "من بعد وصیۃ" کی تعبیر اختیار کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ورثاء کو حصے وصیت نافذ کرنے کے بعد دیے جائیں جس سے خود بخود یہ بات سمجھ آتی ہے کہ یہ وصیت ورثاء کے لیے نہیں ہے، بلکہ غیر ورثاء کے لیے ہے۔ کیونکہ ورثاء کے حصے تو اللہ تعالیٰ نے خود متعین کر دیے ہیں اور اگر قرآن میں مذکور وصیت ورثاء کے لیے بھی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے حصے کیوں مقرر کیے؟ غرض غامدی صاحب کا یہ اصول قرآن کے بیان اور اسلوب کے بھی خلاف ہے اور نبی کریم ﷺ کی حدیث سے بھی صراحتاً متصادم ہے۔

دوسری بات یہ کہ وصیت والا آپشن تب ہو سکتا ہے جب میت کو مرنے سے پہلے اس کا موقع مل جائے یا وہ وصیت کرنے میں دلچسپی رکھتا ہو۔ اگر اس کو وصیت کا موقع ہی نہیں ملا یا وہ وصیت میں دلچسپی ہی نہیں رکھتا تو پھر پہلے تین آپشن قابلِ عمل نہیں ہیں۔

جہاں تک چوتھے آپشن کا تعلق ہے کہ اقرب نفعا کے تحت بچا ہوا مال قریب ترین مرد کو دے دیا جائے۔ اس حوالے سے عرض ہے کہ قریب ترین مرد کو دینے کا اصول قرآن کریم میں کہیں بیان نہیں ہوا۔ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے آباء وابناء میں سے کون منفعت کے لحاظ سے تم سے قریب تر ہے، اسی لیے اللہ نے خود سے ورثاء کے حصے مقرر کر دیے۔ اس آیت میں اقرب نفعا کی بات ورثاء کے حصے مقرر کرنے کے لحاظ سے کی گئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ چونکہ تمہیں اقرب نفعا کا درست ادراک نہیں اس لیے ورثاء کے حصے ہم نے مقرر کر دیے۔ یہاں یہ بات تو زیر بحث ہی نہیں کہ مابقی مال کسے دیا جائے۔ اور اگر اس

---

[1]۔ الترمذي، محمد بن عيسى، سنن الترمذي، (بيروت، دار الغرب الإسلامي، 1998م)، رقم الحديث:2120
At-Tirmidhi, Muhammad ibn 'Isa, Sunan at-Tirmidhi (Beirut, Dar al-Gharb al-Islami, 1998 AD) Hadith Number: 2120

آیت سے اشارۃً اقرب نفعا کا اصول اخذ کر بھی لیا جائے تو پھر سوال ہو گا کہ اقرب نفعا کونسے ورثاء ہیں؟ کیونکہ قرآن نے تو اس کی تعیین نہیں کی۔ چونکہ غامدی صاحب قرآن کریم سے اپنا یہ مدعیٰ ثابت نہیں کر سکتے، اس لیے وہ یہاں بخاری کی حدیث دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں جس میں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ اصحاب الفرائض کو حصہ دینے کے بعد جو بچ جائے وہ قریب ترین مرد کا ہے۔ یہ حدیث خبر واحد ہے اور غامدی صاحب کا اصول ہے کہ دین خبرِ واحد سے ثابت نہیں ہوتا۔ اس اصول کو انہوں نے بہت سے مقامات پر استعمال کر کے عقیدہ و عمل کے بہت سے مسائل میں جمہور سے اختلاف کیا ہے۔ اب غامدی صاحب سے سوال ہے کہ جب آپ کے نزدیک دین خبر واحد سے ثابت ہی نہیں ہوتا تو آپ میراث کے ایک حکم کو خبرِ واحد کی بنیاد پر کیسے ثابت کر رہے ہیں؟

خلاصہ کلام

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ کہ تقسیمِ وراثت میں ایسا ہو جانا عین ممکن ہے کہ ورثاء کے حصص میت کے ترکے سے زیادہ ہو جائیں جیسے اس بات کا امکان ہے کہ میت کا ترکہ ورثاء میں تقسیم ہونے کے بعد بچ جائے۔ ورثاء کے حصص ترکے سے زیادہ ہو جانے والی صورت چونکہ نبی کریم ﷺ کے دور میں پیش نہیں آئی اور نہ ہی اس سے متعلق قرآن کریم میں کوئی واضح ہدایت ہے اس لیے صحابہ کرام نے اس مسئلے میں اجتہاد کیا اور غور و فکر کے بعد عول کے اصول پر اتفاق کیا۔ اگر اس صورت حال سے متعلق قرآن کریم میں کوئی واضح ہدایت ہوتی تو پھر اجتہاد کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ غامدی صاحب کو بہت سے مقامات کی طرح یہاں بھی غلطی لگی اور انہوں نے ترکے کو ورثاء پر پورا پورا تقسیم کرنے کے لیے آیاتِ میراث کی ایسی تاویل و تفسیر کی جو خود قرآنی الفاظ، اسلوب اور نظم سے مطابقت نہیں رکھتی جس کی کچھ تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

یہ ملحوظ رہے کہ مسئلہ مذکور میں ایک اجتہاد حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی ہے جو جمہور صحابہ کرام سے مختلف ہے۔ ان کے اجتہاد کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض ورثاء کو مقدم کیا ہے اور بعض کو مؤخر۔ جنہیں مقدم کیا ہے انہیں کل ترکے میں سے حصہ دیا جائے گا اور جنہیں مؤخر کیا ہے انہیں مابقی میں سے دیا جائے گا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دو قسم کے ورثاء ذکر کیے ہیں: ایک وہ جنہیں ہمیشہ متعین حصہ

ملتا ہے جیسے ماں اور زوجین اور دوسرے وہ جنہیں کبھی متعین حصہ ملتا ہے اور کبھی مابقی جیسے بیٹی اور بہن۔ جن کو ہمیشہ متعین حصہ ملتا ہے انہیں کل مال میں سے حصہ دیا جائے گا اور جن کو ہمیشہ متعین حصہ نہیں ملتا انہیں حصص زیادہ ہو جانے کی صورت میں مابقی دیا جائے گا۔ یہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا اجتہاد تھا جو دلیل کے اعتبار سے اپنا وزن رکھتا ہے مگر دیگر صحابہ کرام اور امت نے اسے عام طور پر قبول نہیں کیا اور نہ ہی اس پر اتفاق ہو سکا۔

اس کے برعکس غامدی صاحب نے مسئلہ مذکورہ کو اجتہادی مسائل کی فہرست سے ہی خارج کر دیا اور قرآن کریم کی آیاتِ میراث کی ایسی تفسیر کی جو نہ قرآن کریم کے نظم سے مطابقت رکھتی ہے اور نہ ہی صحابہ کرام کے فہم سے۔ غامدی صاحب کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ کسی آیت کی تفسیر یا مفہوم اتنے وثوق اور یقین کے ساتھ بیان کرتے ہیں جیسے آیت کی طرح وہ تفسیر اور مفہوم بھی قطعی اور ناقابلِ تردید ہو جس سے سرِ مو انحراف نہ کیا جا سکتا ہو۔ جبکہ وہ کئی مقامات پر اپنی بیان کردہ تفسیر میں ان صحابہ کرام م سے اختلاف کر جاتے ہیں جنہوں نے دین براہِ راست نبی کریم ﷺ سے سیکھا اور جن کی اپنی زبان میں قرآن کریم کا نزول ہوا اور جو قرآنی نظم و اسلوب سے سب سے زیادہ واقف تھے۔ ان حضرات سے اختلاف کا صاف مطلب یہ نکلتا ہے کہ نعوذ باللہ صحابہ کرام کی پوری جماعت کا قرآنی فہم ناقص تھا اور انہیں بعض مقامات پر قرآن سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ حضور نبی کریم ﷺ کی صحبت اور عربی زبان میں مہارت کے باوجود ان حضرات کی رسائی اس نکتے تک نہ ہو سکی جہاں تک غامدی صاحب کی نکتہ رس نگاہ پہنچ گئی۔ زیر نظر مسئلے میں ہی دیکھ لیجیے کہ غامدی صاحب بیٹیوں اور بہنوں کو نصف یا ثلثان ترکے کے مابقی میں سے دیا جانا قرآن کریم سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا علمی رد اگرچہ ہم اوپر کر چکے ہیں لیکن بالفرض اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ اس کا ثبوت قرآن کریم سے ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صحابہ کرام م اس مفہوم کو سمجھنے سے عاجز رہے اور کیا عول کے اصول پر اتفاق کرتے وقت یہ آیات ان کے سامنے نہ تھیں اور کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میراث جیسے قرآنی حکم پر پوری امت شروع سے غلطی پر چلی آ رہی ہو اور آج کے دور میں آیاتِ میراث کی صحیح تفسیر کا انکشاف ہوا ہو۔ ظاہر ہے کوئی بھی صاحبِ علم و دانش آدمی اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دے گا۔